عصری اسلامی اسکولوں میں ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں؟

ڈاکٹر سید خالد جامعی

(ہر کتاب کو اسی زاویے سے دیکھئے) (دوسری قسط)

ہماری نئی نسل اگر دنیا پرست بن گئی ہے، بہترین مستقبل کے لیے ترکِ وطن کر کے دارالحرب میں قیام اگر اس کی اولین ترجیح ہے، اگر عالم اسلام سے ذہانت کا انخلا ''Brain Drain'' ہو رہا ہے، ہر شخص دولت کے زیادہ سے زیادہ حصول کو اگر اپنا مقصد زندگی بنا چکا ہے تو اس کا سبب ہمارا یہ نیا عقیدہ ہے کہ دین و دنیا برابر ہیں، کیونکہ دنیا پہلے ہے، آخرت بعد میں، لہٰذا دنیا پہلے، دین بعد میں۔ بعض جدیدیت پسند کہتے ہیں کہ قرآن میں بھی یہی آتا ہے: ''رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔'' ڈاکٹر حسین نصر کے بیٹے ولی رضا نصر کی کتاب ''Islamic Capitalism'' اب نئے نام ''Meccanomics'' سے منظر عام پر آئی ہے جو اسلامی دنیا میں سرمایہ دارانہ اسلام یا اسلامی سیکولرازم کے جدید مظاہر، آثار سے آگاہ کرتی ہے جو مغرب کو مطلوب ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے ایسی ہی نسل تیار کر رہے ہیں جو رسوم و رواج، عادات و اطوار اور بعض مظاہر کی سطح پر مذہبی ہو، لیکن ذہنی، قلبی، عقلی طور پر مادہ پرستی کی غلام ہو۔

جب آپ مغربی تصورِ خیر: زیادہ آمدنی' بہترین معیار زندگی بلکہ معیار زندگی میں مستقل اور مسلسل اضافے کو بھی اسلامی تصورِ خیر کے طور پر قبول کریں گے کہ اس میں کیا حرج ہے؟ تو آپ کی بیٹی شریف عورت، بیوی، ماں نہیں، سپر اسٹار بننا پسند کرے گی۔ آپ کے بچے عالم دین نہیں بنیں گے، کیوں کہ یہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ نہ وہ کسی ایسے پیشے اور فن کو اختیار کریں گے جس میں کم پیسے ملتے ہوں، کیونکہ زندگی کا مقصد آزادی ''Freedom'' سرمایہ کا ارتکاز ''Accumalation of Capital'' معیارِ زندگی کے خدا کی پرستش ''Worship of standard of Living'' HDI میں اضافہ اور عیش وعشرت لذت پرستی ''Hendonism'' ہے۔ علم وہ ہے جس سے ترقی اور اچھی نوکری ملے۔ اتنا پڑھ لکھ کر اگر اتنے کم پیسے ملتے ہیں تو ایسے علم کا کیا فائدہ؟ جب زندگی کا مقصد معیار زندگی میں اضافہ ہے تو اس مقصد کی

خاطر دین، اخلاق، تہذیب، تمدن، اقدار روایات سب کچھ قربان کی جا سکتی ہیں، ہر عقیدہ اور ایمان خواہ صحیح ہو یا غلط اس کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ دنیا پرستی کی ایک قیمت ہے جو نئی نسل ادا کرنا چاہتی ہے۔ دین و دنیا کو یکساں سطح پر رکھنے کی بھی ایک قیمت ہے۔ بالکل اسی طرح توحید پرستی کی بھی ایک قیمت ہے جو سب کو معلوم ہے، مگر ہم اسے ادا کرنا نہیں چاہتے، لہٰذا مذہبی تاویلوں میں الجھے رہتے ہیں۔ دو مختلف بلکہ متضاد تصوراتِ خیر کو یکساں سمجھنے کی اس بنیادی غلطی کے باعث ہمارے اسلامی اسکولوں میں دی گئی اسلامی تعلیمات، تجوید کے اسباق، ان بچوں کی درست سمتِ سفر متعین نہیں کر سکیں گے۔

جدید اسکول اٹھارہویں صدی کے جدید مغرب کی ایجاد ہیں، لہٰذا ان اسکولوں اور اس کے نظام سے وہی تصویریں نکلیں گی جو مغرب کو پسند ہیں۔ اصل سوال وہ ہے جو شیر کے جواب میں پنہاں ہے کہ یہ تصویر میں نے نہیں بنائی، ورنہ میں شیر کی تقدیر بدل دیتا۔ یہ تصویر شیر بناتا تو انسان وہاں ہوتا جہاں اب شیر کو دکھایا گیا ہے، یعنی شیر کے قدموں میں انسان۔ بالکل اسی طرح یہ جدید مغربی اسکول ہماری علمیت، اسلامی تاریخ وتہذیب نے تخلیق نہیں کیے، مگر اب یہ اسکول مغرب سے متاثر ہوکر ہم نے بھی بنا لیے ہیں، تو کم از کم ان اسکولوں سے نکلنے والی نسل کی تصویر کیسی ہونی چاہیے؟ ہم سب کا دینی، ملی، اخلاقی، تہذیبی، ایمانی فریضہ ہے کہ اس سوال کا جواب مل جل کر تلاش کریں۔ ابتدائی کوشش کے طور پر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے جنریشن اسکول کی کتابوں کا مختصر تجزیہ پڑھیے:

پہلی کتاب ’’The Pan Cake‘‘ کہانی ہے۔ شیف یعنی باورچی سر پر سفید ٹوپی اوڑھے سفید کوٹ پہنے ہوئے نہایت مہذب طریقے سے باورچی خانے میں کیک بنانا سکھا رہا ہے، ایک پیالہ لو، اس میں آٹا اور انڈے ’’Eggs and Flour‘‘ ڈالو اور اس میں دودھ ’’Milk‘‘ ڈالو، ان اجزاء کو پھینٹ لو۔ اب حلوہ بھوننے والے برتن (فرائنگ پین) میں مکھن ڈالو، باورچی مکھن برتن میں ڈال کر اس میں دودھ، انڈے آٹے کا آمیزہ شامل کر دیتا ہے اور پھر کیک بن جاتا ہے، وہ کیک ہوا میں اچھال کر کرتب دکھا رہا ہے۔ باورچی خانہ میں کُتّا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ بچے کیک کے اچھلنے کا منظر حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ بچے برتن ہاتھوں میں پکڑ کر دوڑ رہے ہیں اور کیک اچھال کر اسی برتن میں گرا رہے ہیں۔ یہ کمالات ہیں۔ ایک لڑکی کیک اچھالتی ہے تو وہ کیک فرائی پین میں واپس گرنے کے بجائے محترمہ کے سر کو چھو لیتا اور وہیں قیام پذیر ہو جاتا ہے۔ پیچھے آنے والا ہجوم چیخ رہا ہے، خوش ہو رہا ہے، تالیاں بجا کر شور مچا رہا ہے۔ لکھا ہے: ’’The Pan cake race‘‘۔

ایک اسلامی اسکول میں تہذیب کا سبق ہم مغربی طور طریقوں سے سیکھتے ہیں، اس کی دلیل عموماً یہ دی جاتی ہے کہ مغرب کی غالب تہذیب، تمدن، معاشرت سے واقفیت ضروری ہے۔ اگر ہم

مغرب کی چیزوں سے واقف نہ ہوئے تو مغرب سے بہت زیادہ مرعوب ہوں گے۔ واقفیت اس مرعوبیت کو کم کردے گی۔

دوسری کتاب کا نام ہے: ’’Who is it‘‘ ایک چراغ جل رہا ہے، بچہ سامنے کھڑا ہے، پیچھے کھڑے ہوئے دو بچوں کا سایہ دیوار پر پڑ رہا ہے۔ بچے سایہ دیکھ کر حیران ہیں، پوچھتے ہیں: ’’Who is it‘‘ بچے بتاتے ہیں کہ یہ ’’Biff‘‘ اور ’’Chip‘‘ کا سایہ ہے، پھر امی اور ’’Kipper‘‘ کا سایہ آجاتا ہے، امی ہاتھ میں مچھر مار آلہ لے کر ایک مکھی مار رہی ہیں، پھر کُتّے کا سایہ آتا ہے، پھر خلائی انسان ’’Space man‘‘ کا سایہ نظر آتا ہے۔ بچے حیران ہیں کہ خلانورد یہاں کیسے آگیا ہے؟ پھر والدِ محترم ہنستے ہوئے آتے ہیں۔ بچے کہتے ہیں: ’’No, Its Dad‘‘ ارے! یہ تو ابو جان ہیں۔ موصوف کے منہ میں سگار ٹائپ پائپ لگا ہوا ہے، جنگل کے طوطوں جیسے رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ عصرِ حاضر کا رنگ یہی ہے، بڑے بوڑھے اور مذہبی لوگ بھی اب شوقیہ رنگ برنگے کپڑے پہنتے ہیں اور سفید کپڑے پہننے والوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر، نرس، باورچی Cheif، ٹریفک پولیس، نیوی کے افسروں سے نہیں پوچھتا کہ تم ہمیشہ سفید کپڑے کیوں پہنتے ہو؟ کوئی ڈاکٹر سے نہیں پوچھتا کہ زخمی کو ہمیشہ سفید پٹی کیوں باندھتے ہو؟ کوئی پولیس اور فوجی سے نہیں پوچھتا کہ ہمیشہ ایک رنگ کا لباس کیوں پہنتے ہو؟

تیسری کتاب کی کہانی ہے: ’’The Lost Teady‘‘ امی اور بیٹا سفر کے لیے نکلتے ہیں تو مُنے میاں بھالو لے کر بس میں بیٹھتے ہیں۔ بس سے اترتے ہوئے بچہ بھالو نشست پر بھول جاتا ہے، بس چلی جاتی ہے اور بچہ رونے لگتا ہے: ’’میرا بھالو، میرا بھالو۔‘‘ گھر پہنچتے ہیں تو مُنے میاں نہایت غمزدہ آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ اداسی نے گھر کے در و بام پر اپنے بال پھیلا دیے ہیں۔ تمام بہن بھائی طرح طرح کے، قسم قسم کے کھلونوں کا ان کے بستر پر ڈھیر لگا دیتے ہیں، مگر وہ تمام کھلونے مسترد کرتے ہیں، کوئی ان کو پسند نہیں آتا، کسی پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ عالی شان گھر کے عالی شان کمرے میں گھڑی لگی ہے، مہنگا ٹیبل لیمپ رکھا ہے، شان دار مسہری ہے، قیمتی خوبصورت قالین کارپیٹ بچھا ہوا، نرم نرم موٹے موٹے تکیے ہیں، کرسی پڑی ہوئی ہے، دیواروں پر مصوری کے شاہکار لگے ہیں، کھڑکی میں بہت بڑا شیشہ لگا ہے جس سے رات کا منظر، عمارتیں، چاند، ستارے، پودے، درخت سب نظر آرہے ہیں، مگر منے میاں کا غم کم نہیں ہوتا، آنسو تھمتے نہیں، ہچکیاں، سسکیاں بند نہیں ہوتیں۔ روتے روتے سو جاتے ہیں، رات جیسے تیسے گزر جاتی ہے، صبح سویرے امی ان کو بس کمپنی کے دفتر لے جاتی ہیں جہاں مسافروں کی کھوئی ہوئی اشیاء املاک وغیرہ ’’Lost Property‘‘ کا مال خانہ (اسٹور) ہے جہاں بس سے ملنے والی اشیاء جمع کی جاتی ہیں اور مسافروں کو واپس کی جاتی ہیں۔ منے میاں کو بھالو مل جاتا ہے، ان کی باچھیں

کھل جاتی ہیں۔ یہ کس قسم کا بچہ خلق ہوا ہے جو دنیا بھر کے کھلونے پا کر بھی خوش نہیں ہے؟ اور اس بچے کی تعلیم وتربیت اور اصلاح کرنے والا بھی کوئی نہیں؟ سب اس کی ہر خواہش پوری کر رہے ہیں، جدید اکنامکس اسی انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے، لہٰذا اکنامکس میں انسان انسان نہیں، ''Homoeconomicus'' کہلاتا ہے، ایک افادی، حسی، تجربی، لذت پرست وجود اکنامکس انسان کو طالبِ لذات جانور قرار دیتی ہے: ''Man is a pleasure seeking animal'' ظاہر ہے طالبِ لذات وہی کام کرے گا جو منے میاں کر رہے ہیں، لہٰذا جدیدیت کا مسئلہ نفس مطمئنہ سے کامل محرومی ہے۔

چوتھی کتاب کی کہانی کا عنوان ہے: ''Look Out'' عالی شان گھر ہے جس میں شان دار موٹر سائیکل بچوں والی کھڑی ہے۔ گھر کے اندر صحن چمن ہے، بہترین چمکتی دمکتی گاڑی کھڑی ہے۔ گھاس میں منے میاں موٹر سائیکل چلانے کی تیاری کر رہے ہیں، سر پر ہیلمٹ باندھ رہے ہیں۔ امی گھاس کاٹنے کی مشین سے گھاس کاٹ رہی ہیں۔ منے میاں موٹر سائیکل چلاتے ہیں تو کئی گملوں کو گرا دیتے ہیں۔ شور دھواں پھیل رہا ہے۔ کتا بھاگا ہوا آ رہا ہے۔ بلّی خوف زدہ ہے آواز سے۔ امی نے ہاتھ میں دستانے پہنے ہوئے ہیں، وہ باغ بانی'' Gardening'' میں مصروف ہیں، مگر چیخ رہی ہیں کہ تم کیا کر رہے ہو؟ منے کی امی نے پتلون قمیض پہن رکھی ہے، اسلام نے کب منع کیا ہے کہ عورت مرد جیسے کپڑے نہ پہنے اور ویسے بھی دنیا کو سب سے پہلے عورت مرد کی مساوات کا سبق تو اسلام نے ہی دیا ہے، اس طرح کے کپڑے پہن کر ہی عورت کو آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ بہن خیمے میں بیٹھی ہے، خیمے کے اوپر تار پر بہن کے کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں۔ منے میاں غلط موٹر سائیکل چلاتے ہیں، خیمے کی میخ نکل جاتی ہے، کپڑوں کا تار منے کی گردن میں، تمام کپڑے گر جاتے ہیں۔ بہن چیختی ہے، منے میاں گھر میں گھس جاتے ہیں۔ پھلوں کی الماری، دوات کی بوتلیں، رنگ، منظر نامے ''Scenery'' سب گرا دیتے ہیں، کمرے کا حشر نشر ہو جاتا ہے۔ ابا امی حیرانی سے دیکھتے ہیں، مگر چپ ہیں۔ ڈبل روٹی اِدھر اُدھر اڑ کر گر رہی ہے۔ آخر کار امی آ جاتی ہیں، راستہ بناتی ہیں، گملے رکھتی ہیں، سڑک کا منظر پیش کر دیتی ہیں، ایک بچے کے ہاتھ میں رکو ''Stop'' کا گتہ دیتی ہیں، ایک بچی کے ہاتھ میں بچو رک جاؤ ''Stop Children'' کا پلے کارڈ ہے۔ کتا نگرانی کر رہا ہے، راستے بن گئے ہیں، ٹریفک کا نظام قائم ہو گیا ہے۔ منے میاں مہذب (سولائزڈ) ہو گئے ہیں، اب وہ طے شدہ راستے پر سفر کریں گے، ان شاء اللہ! نقصان نہیں ہوگا۔ نظم و ضبط تو اسلام بھی سکھاتا ہے۔ مغرب نے یہ سب کچھ اسلام سے لیا ہے۔ اسلام کی میراث ہم آکسفرڈ کی کتابوں کے ذریعے مسلمانوں کو منتقل کر رہے ہیں، اس میں کیا حرج ہے؟

پانچویں کتاب کا نام ہے: ''Fun at the Beach'' سرورق پر ایک عورت نیکر پہنے بچی

کے ساتھ ساحل سمندر کی سیر کررہی ہے۔ منے میاں، ابا امی، بہن بھائی' کُتّے کے ساتھ جارہے ہیں۔ ایک آدمی تماشہ دِکھارہا ہے، آئینے کے اندر امی ابا کی شکل بدل گئی ہے۔ آئینوں میں کُتّے، امی ابا، بچے عجیب وغریب نظر آرہے ہیں، سب کا حلیہ خراب ہوگیا ہے۔ کُتّا بھی بالکل ٹیڑھا، پتلا، باؤلا لگ رہا ہے۔ بچے کھیلوں سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔ ابا کُتّے کو پکڑے کھڑے ہیں۔ اب کُتے کو کُتوں کے مخصوص علاقے ''Dog Area'' میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ واپس جاتے ہوئے ابو کُتّے کو لینے آئے تو وہ اتنی زور سے اچھلا کہ ہرطرف مٹی اڑنے لگی۔ بچے کہہ رہے ہیں: ''Oh Floppy'' ہر کہانی کا مقصد لطف، مزہ، ہنسی، مذاق، enjoyment، کیونکہ یہی زندگی ہے، جان ہے تو جہان ہے۔ یہی پیغام ہے، اسی لیے تعلیم بھی اب کھیل تماشہ بنادی گئی ہے۔ ''Fun to learn'' اسی کا نام ہے۔ جس زندگی کا آغاز لہوولعب سے ہو، اس زندگی میں سنجیدگی، تحمل اور دینی اقدار، مذہبی مزاج' نبوی طریقے سے کیسے زندہ رہ سکتے ہیں، لہٰذا لہوولعب کی دینی تعبیر وتفسیر عام ہورہی ہے۔

تصویری کہانی ہے: ''At School'' منے کی امی روتے دھوتے منے کو اسکول کے پہلے دن کھینچتے ہوئے اسکول میں زبردستی لے جارہی ہے۔ منے نے اسکول کے جنگلے کا کونا پکڑلیا ہے، وہ اندر نہیں جانا چاہتا۔ ماں زبردستی کھینچ رہی ہے، وہ رورہا ہے۔ بچے کھڑکی سے منے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ ٹیچر بھالو لے کر منے کو بہلارہی ہے، پچکاررہی ہے۔ آخر کار ماں زبردستی بچے کو اندر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ یہ عجیب ماں ہے جو بچے کو گود میں اٹھانے کے بجائے کھینچا تانی کررہی ہے، محبت تو اس عمل سے ظاہر نہیں ہے۔ منے میاں اندر جاکر بہت خوف زدہ ہیں۔ بچے اور ٹیچر انہیں محبت سے کھلونے دِکھاتے ہیں، آخر کار لالچ میں منے میاں کلاس میں آجاتے ہیں۔ وہاں بچے عجیب عجیب کام کررہے ہیں، کلاس زبردست ہے، کچھ بچے میز کرسی پر بیٹھ کر چھری، چاقو، کانٹے سے کھارہے ہیں، کچھ استری کررہے ہیں، کچھ پکارہے ہیں، کچھ کھیل رہے ہیں۔ ہرطرف سامان ہی سامان ہے، منے میاں بھی کھیل کے طلسم خانے میں گُم ہوجاتے ہیں، وہ بھی کچھ پکانے لگتے ہیں۔ اتنے مزے! ارے یہ تو اسکول نہیں ہے، یہ تو گھر میں کھیلوں کا کمرہ ہے۔ منے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اسکول کا وقت ختم ہوجاتا ہے، امی منے کو لینے آتی ہیں۔ منے میاں گھر جانے پر آمادہ نہیں۔ ٹیچر خدا حافظ کہہ رہی ہیں، منے میاں رورہے ہیں، جنگلہ پکڑ کر زور لگارہے ہیں، امی کھینچ تان کررہی ہیں۔ پہلے اسکول جانے پر راضی نہیں تھے، اب اسکول سے آنے پر راضی نہیں ہیں۔ امی پہلے بھی منے کو کھینچ رہی تھیں، اب بھی کھینچ رہی ہیں۔ ماں کی مامتا سے محروم ایک کریہ وجود ہے جو بچے سے زور آزمائی کررہا ہے۔ اسے گود میں اٹھاؤ، پیار کرو، اسے اسکول کے جبر سے آزاد کرو۔ اتنے چھوٹے بچے کو اتنی کم عمر میں اسکول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟ ظاہر ہے یہ مشورہ عصر حاضر کے انسان کے لیے نامعقول، احمقانہ، ظالمانہ ہوگا، کیونکہ اس کی عقلیت نے اس جبر کو بہ رضا ورغبت قبول کرلیا

ہے۔ عہدِ حاضر کے لوگ پابندی، جبر، تسلط، کو سخت ناپسند کرتے ہیں، لہٰذا جبر کوئی بھی ہو اسے ناپسند کیا جائے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں کے لیے ''فریڈم'' کا جبر قابل قبول ہے، اسی لیے تو دو سال کے روتے ہوئے بچے کو بستر سے کھینچ کر مارتے پیٹتے، ڈانٹتے ڈپٹتے، چیختے چلاتے، شور مچاتے ہوئے دھکے دے کر بغیر ناشتے کے ایک گاڑی میں جبراً بٹھا کر صبح سویرے قید خانے بھیج دیا جاتا ہے اور اس پر تمام مہذب انسان فخر کرتے ہیں۔ تاریخ کے کسی معاشرے میں ایسا بدترین جبر کبھی نہیں ہوا، نہ مذہب کے دور میں، نہ بادشاہت کے دور میں، نہ فلاسفہ کے دور میں، یہ سرمایہ داری کا جبر ہے جو آزادی کے نام پر نہ صرف مسلط ہوا، بلکہ تہہ دل سے تمام اقوام عالم، ملتوں اور امتوں نے مشترکہ طور پر قبول کرلیا اور اس کی مذہبی دلیلیں بھی ایجاد کرلی گئیں۔ لبرل ازم کے عقیدوں کے عین مطابق جو جبر انسان مرضی سے قبول کرلیتا ہے اسے لبرل ازم میں آزادی کہا جاتا ہے۔ جو مرضی سے قبول نہیں کرتا اُسے جبر کے ذریعے آزادی قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ جبر لبرل ازم میں عین عدل کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی جبر کو اپنی مرضی اور آزادی سے لیکن تعقل مذہبی ''Religious rationality'' کی بنیاد پر قبول کرتا ہے تو ایسی آزادی کو لبرل ازم میں آزادی نہیں' پابندی، جہالت، ضلالت، گمراہی اور بدترین ظلم قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ جدید مغربی فلسفے (ماڈرن ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم) کے مطابق ہر عاقل انسان آزادی ہی پسند کرتا ہے۔ کسی قسم کی خارجی ''External'' پابندی پسند نہیں کرتا۔ مذہب کی پابندیاں آسمان سے آتی ہیں اور انسانی آزادی میں کمی کردیتی ہیں۔ کانٹ نے انسان کی تعریف یہی کی ہے کہ جو کسی خارجی ذریعے سے، وحی الٰہی سے، کسی عالم دین سے علم و ہدایت کی روشنی نہیں لیتا، تمام فیصلے عقلیت کی بنیاد پر کرتا ہے۔ ہدایت کے لیے انسان اپنے سے باہر، خارج کی طرف نہیں دیکھتا، بلکہ اپنے اندر جھانکتا اور عقل سے رجوع کرتا ہے، کیونکہ انسان علم، روشنی، ہدایت میں خود کفیل ہے، اسے کسی سے روشنی لینے کی ضرورت نہیں۔ تفصیلات کے لیے انٹرنیٹ پر کانٹ کا مضمون ''What is enlightenment'' کا مطالعہ کیجیے اور اس کی تشریح فوکالٹ کے قلم سے پڑھیے، فوکالٹ کا مضمون ''What is enlightenment'' کے نام سے نیٹ پر موجود ہے۔

جدیدیت کا عقیدہ ہے: آزادی کے عقیدے پر ایمان لاؤ کہ عقیدہ دلیل سے ماورا ہوتا ہے: ''Believe in Freedom''۔ اس بارے میں کسی سوال و اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ جو اس کا انکار کرے گا، اس کے خلاف NATO، U.N.O، U.S.A سب مل کر حملہ کریں گے۔ آزادی ''take for granted'' ہے۔ یہ بدیہی، آفاقی سچائی ہے، اس کی کوئی عقلی دلیل نہیں۔ یہ دلیل کا نہیں، ایمان کا معاملہ ہے۔ آزادی کے عقیدے پر سب کو ایمان لانا ہوگا۔ جو آزادی کے عقیدے کا انکار کرے گا اسے قتل کردیا جائے گا۔ مائیکل مین کی کتاب ''The Dark Side of Democracy'' جمہوریت کے

ذریعے آزادی کے عقیدے کے تسلط کے لیے دنیا بھر میں ہونے والے جمہوری قتل عام کی داستان بیان کرتی ہے۔ جمہوریت پر امن طریقے سے نہیں آئی، یہ قتل عام کے بعد مسلط ہوئی ہے۔ اسی آزادی کے لیے امریکیوں نے دس کروڑ ریڈ انڈین کو قتل کیا۔ تفصیلات اسی کتاب میں پڑھیے۔ ظاہر ہے جب جمہوریت کے تمام مخالفین کو قتل کردیا گیا تو دنیا پر امن ہوگئی، لہٰذا اب جمہوریت پر امن طریقے سے آتی ہے اور دنیا کو بتایا جاتا ہے کہ جمہوریت ہی پر امن تبدیلی کا واحد راستہ ہے۔ الجزائر، ترکی، بنگلہ دیش، مصر ہر جگہ پر امن طریقے سے جمہوریت آرہی ہے۔ جدید تعلیمی اداروں میں جمہوریت کی خونی تاریخ نہیں پڑھائی جاتی۔ عالم اسلام میں جمہوریت کو اسلام سے برآمد کرلیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے جمہوری وزیر اعظم ثابت کیے جاتے ہیں، جبکہ اس جمہوریت میں نہ کسی کو الیکشن لڑنے کی اجازت تھی، نہ الیکشن مہم چلانے کی، نہ ووٹر لسٹ تھی، نہ چیف الیکشن کمشنر۔ اس عظیم جمہوری الیکشن کا نتیجہ ووٹنگ سے پہلے سنا دیا گیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہیں اور نتیجہ سنانے کے بعد سب بیعت کرنے یعنی ووٹ ڈالنے آگئے اور کئی مہینوں تک بیعت کرکے ووٹ ڈالتے رہے۔ ووٹ خفیہ ہوتا ہے، یہ عجیب ووٹ ہے جو خفیہ نہیں اور ایک شخص کو حاکم منتخب کرنے کے بعد ڈلوایا جارہا ہے۔ اسلامی جمہوریت کی یہ شکلیں اسکولوں میں پڑھائی جارہی ہیں۔

لبرل ازم کے عظیم سیاسی فلسفی جان رالز کا شارح ''Derben'' لکھتا ہے کہ جو شخص آزادی، جمہوریت کی عقلی دلیل طلب کرتا ہے، ایسے جاہل شخص کو کوئی جواب نہ دو، اسے گولی ماردو۔ ان موضوعات پر دلیل دینے کی بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سب الحق، الخیر، العلم ہیں، یہ بدیہی حقیقتیں ہیں، جو کسی دلیل کی محتاج ''take for granted'' نہیں۔ یہ ''self evident evedence'' ہیں۔

What Rawls is saying is that there is in a constitutional liberal democracy a tradition of thought which it is our job to explore and see whether it can be made coherent and consistent... We are not arguing for such a society. We take for granted that today only a fool would not want to live in such a soceiety... If one cannot see the benefits of living in a liberal constitutional democracy, if one does not see the virtue of that .ideal, then I do not know how to convince him. To be perfectly blunt, sometimes I am asked, when I go around speaking for Rawls, What do you say to an Adolf Hitler? the answer is [nothing] You shoot him. You do not try to reason with him. Reason has no bearing on this question. So I do not want to discuss it (Derben, On Rawls & Political Liberalism, 2003: 328-329)

اصلاً ہم بچے کو ایک ماہ کی عمر میں ڈے کیئر سینٹر اور ڈیڑھ سال کی عمر میں اسکول کے سپرد کر کے اس کی آزادی سلب کر رہے ہیں، لیکن اپنی آزادی میں اضافہ کر رہے ہیں کہ عصر حاضر کی ماں سے بچے کا بوجھ نہ اٹھایا جاتا ہے، نہ اس کا شور گھر میں دن بھر برداشت کیا جاسکتا ہے۔ بچے، ماں اور گھر والوں کی آزادی کا تقاضا یہی ہے کہ بچے کو ڈے کیئر سینٹر یا اسکول بھیج کر آزاد کر دیا جائے۔ جس معاشرے میں ڈے کیئر سینٹر کھلتے ہیں، اسی معاشرے میں اولڈ ہوم بھی کھولنے پڑتے ہیں۔ جب ماں باپ کے پاس بچے کے لیے وقت نہیں ہے، انہیں سرمایہ اور آزادی چاہیے تو بچے کے پاس بھی آپ کے بڑھاپے میں آپ کی خدمت کے لیے وقت نہیں ہے، اسے بھی سرمایہ اور آزادی چاہیے۔ یقیناً ڈے کیئر سینٹر، اسکول، اولڈ ہوم ہماری آزادی میں بے پناہ اضافہ کر دیتے ہیں۔ لیکن کیا ہمیں آزادی کی منحوس شکلیں قبول ہیں؟ ہماری اسلامی تاریخ میں اور دنیا کی تیئس بڑی تہذیبوں میں یہ تینوں ادارے کیا موجود تھے؟ بلکہ ان تہذیبوں میں ہسپتال، جیل خانے، ہوٹل، ریسٹورنٹ، پاگل خانے، زچہ خانے بھی نہیں تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں تھے؟ ہابیل، قابیل، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میٹرنٹی ہوم کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اہرامِ مصر، دمشق کی اموی مسجد، تاج محل، قرطبہ، عاد وثمود، مصر، روم، یونان، ایران، چین، ہندوستان اور بابل ونینوا کے عجائبات تعمیر کرنے والے اسکول، کالج، انجینئرنگ یونیورسٹی، آرٹ اسکول کے بغیر یہ کمالات کیسے تخلیق کرتے تھے؟ کم ازکم ان سوالات پر غور کی ضرورت تو ہے۔

اللہ کی عبادت بچے پر سات سال میں فرض ہوتی ہے۔ مادہ پرستی، ترقی، مال و دولت کی عبادت ایک سال کی عمر سے پہلے فرض ہوجاتی ہے، اس کا نام آزادی ہے۔ ایک جانب مغرب تنوع کی بات کرتا ہے، دوسری جانب اسکول میں خاص قسم کا لباس پہنا کر تنوع ختم کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کے گھر میں عبادت کے لیے آنے والوں کے لیے لباس کی کوئی خاص شکل یا رنگ مخصوص نہیں کیا گیا، مگر اسکول میں خاص لباس کے بغیر داخلہ ممنوع ہے۔ اسے آزادی کہتے ہیں؟ یعنی حصول آزادی کے لیے پابندی کا سخت ترین نظام۔ بہت سے ملکوں میں تعلیم لازمی ہے، اس کے بغیر آزادی نہیں مل سکتی، دوسرے معنوں میں لوگوں کو آزادی، سرمایہ داری، لبرل ازم، سیکولرازم کا جبر نظر نہیں آتا، اسلام کا جبر سب کو نظر آجاتا ہے۔ آزادی کا ہر جبر جائز، قانونی اور حقیقی ہے، مذہب کا تھوڑا سا جبر بھی ناجائز وغیر قانونی ہے۔ اسکول آزادی اور سرمایہ ''School is the tyrany of freedom & Capital'' کا جبر ہے، یہ جبر عین حق ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ تعلیم اور عورتوں کی تعلیم پر اس قدر زور کیوں ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ عورت کو مرد کے برابر لانے بلکہ مرد جیسا بنانے کا فائدہ کسے ہے اور کیسے ہے؟ تعلیم عام کرنے کے لیے مغربی ممالک اربوں کھربوں روپے کیوں خرچ کر رہے ہیں؟ U.N.O تعلیم عام کرنے

کے لیے’’Rape Free Zone‘‘ تو بنا رہے ہیں، لیکن’’Marriage Free Zone‘‘ کیوں نہیں بنا رہے؟ ان سوالوں کا جواب اس صدی کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی’’John Rawls‘‘ نے اپنی آخری کتاب میں کس خوبصورتی سے دیا ہے۔

China have imposed harsh restrictions on the size of faimlies & have adopted other draconian measurs but there is no need to be so harsh. Instructive here is the Indian state of Kerala, which in the late 1970s empowered women to vote & to participate in politics to receieve & used education & to own & manage wealth & property. As a result, within several years Kerala's birth rate fell below china's without invoking the corecive powers of the state. China's birth rate in 1979 was 2.8 Kerala's 3.0. In 1991 these rates were 2.0 & 1.8 respectively. [John Rawls., The Law of People with the Idea of Public Reason Revisited, Harvard University Press, USA. 2003, p. 110]

چھٹی کتاب کا نام ہے’’A Good Trick‘‘ بہت بڑے ڈبّے سے غالیچہ’’A-rug‘‘ نکالا جارہا ہے، بچے حیرت سے دیکھ رہے ہیں، غالیچے کے نیچے سفید چادر’’A Sheet‘‘ ہے، اُسے اتارا گیا، اس کے اندر سے بڑا ڈبہ’’A big box‘‘ نکلا، اب عورت مرد اس ڈبّے کو اوپر اٹھاتے ہیں، اس کے اندر سے ایک چھوٹا ڈبہ’’A littlebox‘‘ نکلتا ہے، اب عورت مرد پوچھتے ہیں: بتاؤ اس کے اندر کیا ہے؟ ڈبہ کھلتا ہے، اس کے اندر سے مسکراتا ہوا بچہ نکلتا ہے جس کا نام ہے’’Kipper‘‘۔ یہ ہے ترکیب’’Trick‘‘ پری نرسری کے بچے کو کرتب اور شعبدے بتائے جارہے ہیں، مگر کیوں؟ کیا وہ حقیقت اور شعبدے میں فرق کرسکتا ہے؟

اور اب ساتویں مگر آخری کتاب پڑھیئے:’’Six in a Bed‘‘ امی ابو بستر میں لیٹے ہوئے رسالہ اور کتاب پڑھ رہے ہیں، کمرہ نہایت شاندار، مسہری زبردست، اس پر چار موٹے موٹے نرم نرم تکیے، امی ابو کے سرہانے ٹیبل لیمپ دیوار میں نصب ہیں الگ الگ، تاکہ روشنی کتابوں پر آئے۔ چھوٹا بچہ بھی کتاب لے آتا ہے، کمرے کے کونے پر کھڑا ہو کر جھانکتا ہے۔ امی ابو اسے دیکھتے ہیں تو اپنے بستر پر بلالیتے ہیں۔ وہ دونوں کے بیچ میں بیٹھ جاتا ہے، اپنی کتاب پڑھنے لگتا ہے۔ امی ابو اپنی کتاب/ رسالہ رکھ کر اس کے ساتھ مصروف ہوجاتے ہیں۔ بڑا بھائی بھی اپنا کھلونا لے کر امی ابو کے کمرے میں جھانکتا ہے، دونوں اسے بھی بلالیتے ہیں۔ وہ بھی مسہری پر چڑھ جاتا ہے، اپنا بھالو ابا کے پاس رکھ دیتا ہے اور چھوٹے بھائی کی کتاب میں دلچسپی لیتا ہے، اشارہ کرتا ہے، بڑی بہن بھی اپنا بھالو لے کر پہنچ جاتی ہے۔

امی ابا اسے دیکھتے ہیں تو اسے بھی بستر پر بلا لیتے ہیں۔ وہ اپنی امی کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے، بھالو رکھ دیتی ہے اور چھوٹے بھائی کی کتاب میں دلچسپی لیتی ہے۔ اب گھر کی آخری عظیم ہستی کُتّے صاحب بھی تشریف لے آتے ہیں، وہ تنہائی کا شِکار ہو گئے ہیں، لہٰذا وہ بھی دروازے سے جھانکتے ہیں، امی ابو ابھی غور کر رہے ہیں کہ حضرت کے ساتھ کیا معاملہ کریں، وہ چھلانگ لگا کر مسہری پر چڑھتے ہیں، مسہری پہلے ہی وزن سے ڈانواڈول تھی، اب جو کُتّے کا وزن آیا تو مسہری کا توازن بگڑ گیا، ایک پایا ٹوٹ گیا، سب لوگ چیخ رہے ہیں، بھالو صاحب نیچے گر رہے ہیں، بہن بھی نیچے گر رہی ہے۔

ان کتابوں میں کس قسم کی معاشرت، کس قسم کا طرزِ زندگی بتایا گیا ہے؟ کتاب بچے کے لیے پری نرسری کی سطح پر آئیڈیل ہوتی ہے، کیوں کہ اس کی شخصیت بننے کے عمل میں ہوتی ہے۔ پڑھایا وہ جاتا ہے جو عالی، مثالی و معیاری ''Superior, Ideal, Standrised'' ہو، آپ کے دین، تاریخ، تہذیب، علمیت اور کلیت سے ہم آہنگ ہو، تو کیا یہ نصابی کتابیں اس معیار پر اترتی ہیں؟

آکسفرڈ کی یہ کتابیں ایک خاص طبقۂ اشرافیہ ''Elite Class'' کے طرزِ زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں، جس کا حصول ننانوے اعشاریہ ننانوے فی صد لوگوں کے لیے قیامت تک ناممکن ہے۔ آپ اعشاریہ ایک فی صد لوگوں کے طرزِ زندگی کو معیاری اور مثالی طرزِ زندگی کے طور پر پیش کر کے بچوں کو کس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں؟ دنیا کی طرف یا آخرت کی طرف؟ حقیقت کی طرف یا خواب کی طرف؟ مادہ پرستی کی طرف یا خدا پرستی کی طرف؟ جو بچہ اپنی کتابوں میں ایک خاص مادہ پرستانہ، پرتعیش، چھچھورے، غیر ذمہ دارانہ، غیر اخلاقی، احمقانہ، جاہلانہ طرزِ زندگی کو دیکھے گا، کیا وہ اس سے مختلف طرزِ زندگی کو حیرت یا حقارت کے ساتھ نہیں دیکھے گا؟ وہ کتابوں میں بتائے گئے اس غیر حقیقی، ناممکن طرزِ زندگی کے حصول کا خواب بچپن سے دیکھے گا اور جب اسے پا نہ سکے گا تو یقیناً وہ خود کو محروم و مجبور، بے بس اور بے کس تصور کرے گا۔ جدید سیکولر نظامِ تعلیم اس طرزِ زندگی کے حصول کی آرزو اور جستجو کو زندگی کا اصل ہدف بناتا ہے۔ مختصراً اس نظام کا مقصد ناممکن کی جستجو ہے اور جو ممکن ہے اس نظامِ تعلیم کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیا ان کتابوں سے بچے کی مذہبیت، اخلاقیات، ارادوں، عزائم، خواہشات میں بنیادی نوعیت کا تغیر واقع نہیں ہوگا؟

اس تجزیے کے ذریعے اس طریقے کو متعارف کرنے کی کوشش کی گئی جس کے ذریعے تمام اسلامی اسکولوں کے مخلص منتظمین، اساتذہ، مالکان، سرپرست اپنے نصاب کا ازسرِنو جائزہ لیں اور کسی مشترکہ نئے نصاب کے انتظار کے بجائے موجود میسر نصاب میں فوری اصلاح کا آغاز کر دیں۔

(جاری ہے)